POSTED AT LPC Delhi RMS ON 10-11 April 2024, R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511
Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85واں سال

Date of Publication: 09-04-2024 • Price: 5/- • 1-14 April 2024 • Issue: 13,14 • Vol:83
یکم تا ۱۴ اپریل ۲۰۲۴ء • شمارہ ۱۳، ۱۴ • جلد ۸۳

کچھ دیدہ کچھ شنیدہ

نیّر مسعود کی شخصیت کے چند پہلو

شعیب نظام

میں نے 1978 میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت صدر شعبہ پروفیسر شمیم احسن صاحب تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو ڈانٹتے تو بہت کم تھے مگر ایک غیر محسوس سا خوف سب پر طاری رہتا تھا جب کہ ملک زادہ صاحب کا رویہ اپنے شاگردوں کے ساتھ تقریباً دوستانہ رہتا تھا۔ یہ دونوں اساتذہ سگریٹ پیتے ہوئے کلاس لیتے تھے۔ ملک زادہ صاحب کے پاس جب کبھی اتفاق سے سگریٹ ختم ہو جاتی تو مجھ سے استفسار کرتے کہ کیا آپ کے پاس سگریٹ ہے۔ جواب اثبات میں ہونے پر مجھ سے سگریٹ لے کر پھر لیکچر دینا شروع کر دیتے۔ اسی دوران انیس اشفاق صاحب سینئر ریسرچ اسکالر تھے۔ ان کی خصوصی حوصلہ افزائی میرے اور شارع قدوائی کے ساتھ تھی۔ انھی کے وسیلے سے پہلے ہم لوگ شہنشاہ مرزا، وقار ناصری اور نیر مسعود سے متعارف ہوئے اور پھر ایک دن انیس اشفاق کے ساتھ نیر مسعود صاحب جو شعبۂ فارسی میں پروفیسر تھے اور اردو والوں کا جانا پہچانا چہرہ تھے، سے ملنے کا پروگرام بنا۔ میرے ذہن میں شمیم احسن صاحب کی شیروانی اور ٹوپی گھوم رہی تھی۔ ملنے پر کچھ عجیب سا لگا وہ ہلکے گلابی رنگ کی چینٹ اور بڑے چار خانے کی شرٹ اور چپل پہنے ہوئے تھے اور بہت دبلے پتلے تقریباً بیمار سے لگ رہے تھے ان کے ماتھے پر گومڑ کا ایک نشان بھی تھا، مگر آواز خاصی دم دار اور متاثر کن جو ان کے جسم سے میل نہیں کھا رہی تھی۔

میں نے خود کو بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ میری ملاقات نیر مسعود صاحب سے ہی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد میں اور شارع قدوائی اکثر شہنشاہ مرزا یا انیس اشفاق کے ساتھ نیر صاحب کے گھر جانے لگے۔ یہ ایک وسیع و عریض کوٹھی تھی جو 'ادبستان' کے نام سے مشہور تھی۔ ہم لوگوں میں سے کوئی نیر بھائی کہہ کر آواز دیتا اور وہ چابی سے گرل کا تالا کھول کے خود گیٹ تک آ جاتے۔ ان کے گیٹ میں ہمیشہ تالا لگا رہتا تھا۔ اتنے بڑے مکان میں باہر کوئی گھنٹی بھی نہیں لگی تھی۔ صبح نو بجے سے گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے تک وہ باہر اپنے ڈرائنگ روم میں ہوتے تھے اس کے بعد شام کو مغرب بعد سے رات نو بجے تک وہ پھر وہ ڈرائنگ روم میں ہی اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ گویا صبح اور شام یہی ملاقات کا وقت ہوتا تھا۔ اس کے بعد غلطی سے آنے والا شخص بھی آوازیں لگاتا وہ صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوتی تھی۔ اس کے شکار بڑے بڑے ناقد اور محقق بھی ہو چکے تھے۔ نیر صاحب سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی دلچسپی کا اندازہ کیسے کر لیتے تھے یہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آ سکا۔ وہ کرکٹ، بیڈمنٹن، ہاکی اور فلموں پر بہت دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ کبھی کبھی ابن صفی کی نثر اور ان کے ناولوں کے کرداروں پر بہت دلچسپ گفتگو کرتے ہوئے میں نے انھیں سنا ہے۔ جاڑے شروع ہونے سے پہلے میں نے گدّے اور لحافوں میں دھاگے ڈالتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے نواڑ کے پلنگ بھی بن لیتے تھے۔ لکڑی کے طرح طرح کے پنجرے اور بہت خوب صورت چھڑیاں بناتے اور اپنے قریبی دوستوں کو تحفتاً پیش کر دیتے تھے۔ باہر بہت بڑے لان میں پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ پپیتے اور پھل دار درخت بھی لگے تھے۔ خود سیڑھی لگا کر پکے ہوئے پپیتے توڑ لیتے تھے۔ انھیں پینٹنگ بنانے اور کیلی گرافی سے بھی کمال کی دلچسپی تھی۔ وہ کئی آلات موسیقی بجا لیتے تھے، خصوصاً جب بجلی چلی جاتی تھی تو وہ اپنے کمرے میں کبھی کبھی بانسری بجاتے تھے جس پر یاد نہ جانے بیتے دنوں کی دھن بہت خوب صورت بجاتے تھے۔ اس حال میں انھیں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اردو اور فارسی کے اتنے بڑے اور اتنے مشہور عالم ہیں۔ صرف ایک واقعہ جس کے راوی انیس اشفاق صاحب ہیں، پیش ہے:

"ایک بار وہ نواڑ سے اپنا پلنگ بن رہے تھے کہ گیٹ پر ایک نو وارد پروفیسر تشریف لائے اور انھیں آواز دے کر بلایا اور کہا اندر جا کر نیر صاحب سے بتا دیجیے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ نیر صاحب نے بڑی معصومیت سے فرمایا کہ بتا دیجیے۔ انھوں نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ اندر جا کر بتاتے کیوں نہیں کہ میں پروفیسر نیر مسعود صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ نیر صاحب نے بڑی مشکل سے انھیں یقین دلایا کہ وہی نیر مسعود ہیں۔ ہم ان صاحب کی حیرت کا صرف اندازہ کر سکتے ہیں۔ دیر سے میں نے اپنی حیرت پر قابو پایا تھا۔"

ایک دن انھوں نے بتایا کہ وہ لڑکپن میں خوب شرارت کرتے تھے اور خوب پتنگیں لوٹتے تھے اور کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے دوسرے لڑکے بانس ڈنڈی پر چڑھنے لگتے تو وہ پیچھے کا اشارہ کر دیتے اور وہ جھونکا اور دور چلی جاتی۔ ڈر کے مارے محلے کے لڑکوں نے ان کے گھر کی طرف سے ادھر کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اب کٹی ہوئی پتنگ جو ہاتھ ڈوری کے اندر آ جاتی اس پر صرف نیر بھائی کا قبضہ ہوتا۔ مغرب کے وقت اگر کہیں سے کوئی مردہ سانپ مل جاتا تو کئی دن اس کے کرتب دکھائے جاتے۔ ہوتا یوں کہ ایک پکی مضبوط ڈوری سے باندھ کر سڑک کے دوسرے کنارے پر رکھ دیا جاتا اور جب کوئی خوانچے والا ادھر سے آتا دکھائی دیتا تو اسے دھیرے دھیرے اس طرح کھینچا جاتا کہ وہ خوانچے والے کے آگے اور اس کے پاس پہنچ جاتا اور رینگتے ہوئے سانپ کو دیکھنے کے بعد وہ خوانچہ پھینک پھانک کر سانپ سانپ چلاتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا تب تک ڈوری کے سہارے سانپ واپس کھینچ لیا جاتا اور خوانچے والے اور دوسرے راہ گیروں کے ساتھ نیر بھائی بھی ہر طرف سانپ کو ڈھونڈنے میں سب کی مدد کرتے نظر آتے اور گھر کے ہم عمر لڑکے دن بھر خوب خوب شرارتیں کرتے مگر والد صاحب (پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب) جب تانگے میں یونیورسٹی سے گھر واپس آتے تو سب لڑکے نہایت معصوم اور شریف زادوں میں تبدیل ہو جاتے۔ باقی کی شرارتیں اس وقت کے لیے اٹھا رکھی جاتیں جب والد صاحب کسی ضروری کام میں مصروف ہو جاتے۔ نیر صاحب لڑکپن میں دوسرے ہم عمر دوستوں کو حیران اور مرعوب کرنے کے لیے زہر پیا کر دکھاتے تھے۔

نیر صاحب نے بچپن میں ہی ایک ڈراما لکھا تھا جسے دیکھ کر مسعود صاحب بہت خوش ہوئے تھے۔ اور ایک دن اپنے دوستوں کو بلا کر نیر صاحب کو نئے کپڑے پہنا کر ڈراما سنانے کا حکم دیا۔ نیر بھائی بتاتے تھے کہ نئے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ یہ ڈراما اتر پردیش اردو اکادمی نے "سیمیا" کے نام سے شائع کیا ہے جو اب بھی دستیاب ہے۔

نیر بھائی کو بچپن میں پرانے لکھنؤ کی گلیوں میں گھومنا اور تاریخی

عادتوں کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ دور دور تک سیر و گشت کرتے رہتے تھے۔ اس طرح پڑھائی کی طرف رجحان کم ہونے لگا اسکول سے شکایت آنے کے بعد والد صاحب نے ان پر نظر رکھنی شروع کی اور تھوڑی بہت سختی بھی کی گئی جو نیر مسعود کو نیر مسعود بنانے کے لیے شاید بہت ضروری بھی تھی۔

نیر بھائی اتنے وضعدار اور شریف انسان تھے کہ جب محسن خان ان کے گھر کے پاس کرایے پر رہتے تھے تو پاکستان سے ان کی ساس کے جب فون آتے تھے تو اکثر نیر بھائی محسن کو بتانے جاتے تھے کہ آپ کا فون آیا تھا پندرہ منٹ بعد پھر آئے گا۔ محسن وہ گھر چھوڑ کر بعد میں نیر بھائی کے گھر سے تقریباً دو کلومیٹر دور دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے تھے ان کا ایک خط نیر بھائی کے پتے پر آ گیا۔ نیر بھائی دو کلومیٹر پیدل وہ خط دینے محسن کے گھر گئے تھے ظاہر ہے محسن خاصے شرمندہ اور حیرت زدہ بھی ہوئے تھے۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ نیر بھائی کے گھر پر صرف اور صرف ادب کی ہی باتیں ہوتی تھیں یا کوئی علمی گفتگو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں علم پنپ رہا ہو، علم پرورش پا رہا ہو اور علم تقسیم ہو رہا ہو۔ ہاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ حاصل کرتے رہتے تھے۔

1980 میں میں نے امتیازی نمبروں سے ایم اے پاس کیا اور مرزا یاس یگانہ چنگیزی پر پی ایچ ڈی کرنے کا منصوبہ بنایا اور ڈرتے ڈرتے ایک دن میں نے صدر شعبہ پروفیسر شبیہ الحسن سے گزارش کی کہ میں نیر صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے گھورتے ہوئے سوال کیا کہ آپ شعبۂ اردو کے کسی پروفیسر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی نہیں کرنا چاہتے۔ میں خاموش رہا انھوں نے ہی پھر مجھ سے فرمایا کہ اگر نیر صاحب تحریری طور پر شعبے کو اور رجسٹرار صاحب کو اپنی منظوری دے دیں تب میں غور کروں گا۔ ظاہر ہے یہ میرے لیے بہت مشکل مرحلہ تھا۔ میں شام کو مغرب بعد نیر صاحب کے گھر حاضر ہوا اور انھیں شبیہ الحسن صاحب کی شرائط سے ڈرتے ڈرتے آگاہ کیا۔ وہ کچھ نہیں بولے اندر جا کر اپنا لیٹر پیڈ لا کر منظوری کے دو خطوط لکھ کر انھیں الگ الگ لفافوں میں ڈال کر میرے حوالے کر دیے۔ فرط مسرت سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اس دن آداب کر کے میں نے کچھ جلدی ہی اجازت طلب کر لی۔ دوسرے دن میں نے دونوں خطوط شبیہ الحسن صاحب کی خدمت میں پیش کر دیے اور اس طرح لکھنؤ یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ ایک مثال تھی کہ ایک شعبے سے ایم اے کرنے والے طالب علم نے دوسرے شعبے کے پروفیسر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنے کی منظوری حاصل کی۔

اپنی تحقیق کے دوران یگانہ کی کتابیں حاصل کرنے میں مجھے جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ ایک الگ باب ہے اس کا تذکرہ پھر کبھی۔ مجھے کئی نایاب کتابیں نیر صاحب کے ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہو گئیں اس طرح میں نے اپنا تحقیقی کام شروع کر دیا۔

اس دوران نیر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ان کی اردو اور انگریزی کی ہینڈ رائٹنگ اتنی منفرد تھی کہ کسی دوسرے کے یہاں مثال ملنی مشکل ہے۔

ہم لوگ اکثر نیر صاحب کے گھر پر نشستوں کا اہتمام کیا کرتے تھے اس میں مخصوص لوگ شریک ہوتے تھے۔ شرکا میں انیس اشفاق، شہنشاہ مرزا، وقار ناصری، محمد مسعود، شافع قدوائی اور میں شریک ہوتے تھے۔ نیر صاحب ہم سب سے نئی تخلیقات کی توقع رکھتے تھے جو زیادہ تر پوری ہو جاتی تھیں۔ ان نشستوں میں کبھی کبھی تصور حسین زیدی یا عثمان غنی اور انیس انصاری صاحب بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ایک نشست میں میرے اور شہنشاہ مرزا کے اصرار پر عرفان صدیقی صاحب بھی شریک ہوئے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شہر کے دو اتنے معروف قلم کار ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں اس لیے میں نے عرفان صاحب کا تعارف بھی نہیں کرایا۔ دوسرے دن نیر صاحب نے استفسار کیا کہ آپ کے ساتھ کون صاحب آئے تھے؟ میں نے حیران ہوتے ہوئے انھیں بتایا کہ وہ عرفان صدیقی صاحب تھے۔ نیر بھائی پریشان ہو گئے اور وقت لے کر عرفان صاحب کے گھر پر تشریف لے گئے۔ اس طرح دھیرے دھیرے دونوں کی دوستی ہو گئی۔ شمس الرحمن فاروقی پہلے سے نیر مسعود کے سب سے قریبی دوست تھے۔ کانپور سے اکثر زیب غوری بھی نیر صاحب کے گھر جایا کرتے تھے اسی دوران پی آئی بی میں شمس عرفان صاحب کے ساتھ ملازمت کرنے لگا تھا۔ اسلم محمود لکھنؤ میں ڈی آر ایم کی حیثیت سے موجود تھے۔ ان کا بھی نیر صاحب کے یہاں اکثر جانا ہوتا تھا۔ ان لوگوں کی موجودگی میں عجیب عجیب موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی مثلاً دہر کے اقسام، درندوں کے خصائل، پرندوں کے سکھانے کے عمل پر گفتگو، ہالی ووڈ کی فلمیں، مارلن منرو کی خوب صورتی اور الفریڈ ہچکاک کی ہدایت کاری۔ ظاہر ہے اس دلچسپ اور معلوماتی گفتگو کے دوران میں ایک خاموش سامع کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ ہاں وہاں سے اٹھنے کے بعد اکثر مجھے یہ دنیا بدلی بدلی سی نظر آتی تھی۔ اسلم محمود کو انگریزی کے مشہور ناولوں کو جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کافکا، کامیو، ورجینا وولف، فلابیئر، ٹالسٹائی، دستوئیفسکی، ہرمن میلول وغیرہ کے ناولوں پر نیر صاحب ایسی عمدہ گفتگو کرتے تھے کہ ہمارے انگریزی کے پروفیسر انھیں سن کر حیرت زدہ ہو جاتے۔ نیر صاحب فارسی اور ہندی کے مصنفوں کی اہم تخلیقات سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے کافکا جیسے مشکل پسند افسانہ نگار کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا جو کتابی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ نیر صاحب بہت اچھے پینٹر بھی تھے اپنی کتابوں کے ٹائٹل خود بناتے تھے۔ میرے اصرار پر میری مرتب کردہ کتاب 'انتخاب یگانہ' کا ٹائٹل بھی نیر بھائی نے ہی بنایا تھا۔

نیر بھائی کو پرندوں کے خصائل، ان کی غذا اور ان کے اطوار سے بخوبی واقفیت تھی بقول انیس اشفاق سنجیدہ ادبی گفتگو کے دوران چوک سے کوئی شناسا پرندہ خرید کر سیدھے نیر بھائی کے یہاں حاضری دیتا تو اچانک گفتگو کا موضوع بدل جاتا اب باتیں اس پرندے کے خصائل اور خوراک پر ہونے لگتیں جو دیر تک اور دور تک چلتی جاتیں۔

میری بیوی کے گھٹنوں میں تکلیف رہنے لگی تھی خاصے علاج کے بعد بھی فائدہ نہیں ہو رہا تھا ایک دن باتوں باتوں میں ذکر نکل آیا۔ نیر صاحب نے مجھے ایک حکمت کا نسخہ لکھ کر دیا اور بتایا کہ کس طرح اس سے تیل کشید کیا جائے گا پھر کچھ سوچتے ہوئے اندر گئے اور ایک تیل کی شیشی مجھے لا کر دی جس میں آدھی شیشی سے کم تیل تھا اور بتایا کہ میں نے اسے کشید کیا تھا تکلیف ختم ہونے کے بعد بچ گیا ہے۔ اس کو لگانے کے بعد اوڑھ کر لیٹ جائیے اگر پسینہ نکل آیا تو پھر درد نہیں ہوگا۔ میری بیوی کا درد اسی تیل سے ٹھیک ہو گیا اور مجھے تیل کشید کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ نسخہ میرے کاغذوں میں کہیں اب بھی ہوگا۔

وہ جلد بندی بہت نفاست سے کرتے تھے۔ اپنے کتب خانے کی جن کتابوں کی جلد خراب ہو جاتی تھی ان کی جلد بندی وہ خود کرتے تھے۔ نفاست کا ذکر میں نے محض جلد بندی کے سلسلے میں کر دیا ہے ان کے ہر کام میں اور گفتگو میں یہ نفاست اس قدر موجود ہوتی تھی کہ وہ کبھی عام دنیا کے انسان معلوم نہیں ہوتے تھے۔

نیر بھائی اسی نفاست سے اپنے کبوتروں کو بھی کترتے تھے اور تمام احباب کے خطوط کا جواب بھی پابندی سے دیتے تھے۔ بہت سے ٹی وی کے ڈسکشن میں نیر بھائی اور میں ساتھ ساتھ شریک ہوئے۔ وہ دھیمے لہجے میں اور کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہتے تھے کہ سننے والا حیران رہ جاتا۔ یہی خوبی ان کی تحریروں اور خطوط تک میں ہے۔ نیر صاحب اپنی بات بہت نرم لہجے میں کہنے کے عادی تھے ایک بار تراجم پر مذاکرہ اور ہاؤس میں نفاست کر رہا تھا ذکر نکلا کہ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے میں کیا مسائل درپیش آتے ہیں۔ نیر بھائی نے نرم لہجے میں کہا کہ منظوم تخلیقات کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ تیسرے شریک نے انگریزی کی ایک مشہور نظم کا حوالہ دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا کہ اس کا منظوم ترجمہ فلاں صاحب نے کیا ہے، جو اصل کے عین مطابق ہے جس سے کہ تردید کی گئی، وہ صاحب تقریباً اپنی بات پر اڑ گئے تب نیر بھائی نے انگریزی نظم کا ایک Stanza پڑھ کر پوچھا کہ اس میں کس چیز کا ذکر ہے اور اردو نظم کا ایک اس کا ترجمہ پڑھ کر دریافت کیا کہ دونوں میں کیا مطابقت ہے۔ تب جا کر وہ صاحب خاموش ہوئے۔ نیر صاحب عربی زبان بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے مگر ان کا طریقہ یہ تھا کہ سامنے والے کو دیکھ کر اس کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔

ایک اور ٹی وی پروگرام میں افسانوں کے موضوع پر گفتگو ہونی تھی، کمپیرنگ میں ہی کر رہا تھا نیر بھائی بھی شریک تھے چودہ، پندرہ منٹ کی گفتگو ہو چکی تھی کہ نیر بھائی نے گفتگو کے دوران کہا کہ پاکستان میں انتظار حسین کے یہاں قدیم قصوں کے حوالے سے آج کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پروڈیوسر صاحب نے ریکارڈنگ روک دی اور آ کر فرمایا جناب پاکستان کا نام مت لیجیے۔ کیمرہ مین اور لائٹنگ اسٹاف نے کہا کہ اب کھانے کا وقفہ ہو گیا ہے، ریکارڈنگ اس کے بعد ہوگی۔ ہم لوگ بھی وقت گزاری کے لیے چائے وائے پینے کینٹین چلے گئے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد دوبارہ ریکارڈنگ شروع ہونے والی تھی کہ نیر صاحب نے دھیرے سے مجھ سے کہا کہ جب پندرہ منٹ گزر جائیں گے تب اس بار آپ پاکستان کا ذکر ضرور کیجیے گا۔ دیکھتے ہیں آج کتنی بار ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ میں نے حکم کی تعمیل کی مگر دوسری بار ریکارڈنگ نہیں روکی گئی۔ پروڈیوسر نے مجھ سے شکایت ضرور کی۔ میں نے کہا جناب ادب اس طرح نہیں بانٹا جا سکتا جیسے ملک بٹا تھا۔ آپ چاہیں تو پھر سے ریکارڈنگ کر لیں مگر شاید وہ بھی تھک گئے تھے۔

یہاں پر ٹی وی کے ایک پروگرام کا ذکر اور بھی کیے دیتا ہوں اردو پروگرام کے افسر مظہر محمود میرے دوست بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں تاریخ کو مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک لائیو پروگرام ہوگا آپ دیکھ لیجیے۔ میں نے انھیں لکھنؤ کے دو شرکا کے نام بتائے کہ انھیں مدعو کر لیجیے۔ ظاہر ہے تحریری گفتگو ہی ہوتی تھی۔ اب ہمارے رہنما ادب سے کوئی لینا دینا تو رکھتے نہیں ہیں۔ تب صرف دوردرشن تھا اور پورے ملک میں پروگرام دیکھے جاتے تھے۔ میں کانپور سے خاصا پہلے نکل لیا کہ کہیں جام وام میں پھنس کر دیر نہ ہو جائے۔ میں ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے دوردرشن پہنچ گیا۔ مظہر صاحب نے بتایا کہ ذرا گڑبڑ ہو گئی ہے فائل روٹین میں دستخط کے لیے ڈائرکٹر کے پاس جاتی ہے۔ انھوں نے پہلی بار آپ کے بتائے ہوئے دونوں نام کاٹ کر نیر مسعود اور فاروقی صاحب کا نام لکھ کر دستخط کر دیے ہیں۔ مظہر نے کہا کہ آپ کے تو دونوں حضرات سے خاصے مراسم ہیں۔ میں نے کہا مراسم اور بے تکلف دوستی میں فرق ہوتا ہے۔ میں دونوں حضرات کا بہت احترام کرتا ہوں نیر بھائی چوں کہ بہت شریف انسان ہیں اس لیے ان سے تو میں گزارش کر سکتا ہوں مگر فاروقی صاحب سے بات کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میرے مشورے پر مظہر صاحب نے ڈمی بنا کر ریکارڈنگ مکمل کرا لی اور دونوں حضرات سے گزارش کر کے انھیں بہت جلد بلا لیا۔ میرے ہی مشورے پر مولانا لائبریری سے ابوالکلام آزاد پر بنا ڈاکومنٹری پروگراموں کے پرانے کیسٹ بھی آ گئے۔ پروگرام شروع ہوا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد میرے منہ سے غیر ارادی طور پر ایک سوال نکل گیا۔ بہ چونکہ احتیاطاً سوال میں نے نیر بھائی سے کیا تھا مگر سوال فاروقی صاحب نے لپک لیا اور بولے مولانا بھولے تھے انھوں نے ہمایوں کبیر کو پرچے بھیج کر کتابیں احمد نگر قلعہ سے منگائی تھیں اور انھیں اپنی یادداشت بتاتے رہے۔ وہ کسی فارسی یا عربی کے شعر کو کھپانے کے لیے بہت تصنع آمیز نثر لکھتے تھے جس سے اردو نثر کو بہت نقصان ہوا، فطری نثر (بقیہ صفحہ ۷ پر)

انشائیہ

اسے نہ پڑھیے، پلیز!

محمد اسداللہ

برادرِ کرم! آپ یہ مضمون نہ پڑھیے! آپ کے کسی کام کا نہیں۔ اس اخبار میں آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے اور بھی عمدہ قسم کے بہتر مضامین جمع کیے گئے ہیں، آپ ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

ارے! آپ پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اسے چھوڑ دیجیے پلیز، آگے بڑھ جائیے۔ اسے نہ پڑھنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور پڑھ کر بھی کوئی فائدہ نہیں۔ ایسا کام کیوں کیا جائے جس سے تضیعِ اوقات کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ دنیا میں بے شمار ایسی کتابیں، رسالے اور تحریریں ہیں جن کا مطالعہ انسان کے لیے بے حد نفع بخش ہے۔ بعض نگارشات انسان کو اندر تک جھنجھوڑ ڈالتی ہیں اور اس کی زندگی بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ یقین جانیے یہ اس قسم کی تحریر ہرگز نہیں ہے۔ آپ بلاوجہ اس میں اپنا سر کھپا رہے ہیں۔ آپ مانتے کیوں نہیں؟ ایک بار کہہ دیا کہ اسے نہ پڑھیں تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ کیا اس مضمون میں سرخاب کے پر لگے ہیں جو آپ پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شوقِ مطالعہ کے ہاتھوں آپ اتنے ہی بے بس ہیں تو دنیا میں پڑھنے کے لیے بے شمار چیزیں پڑی ہیں۔ اخباروں میں چھپی چھوٹی خبریں پڑھیے، وہ بڑی خبریں بھی پڑھیے، جو ان اخباروں سے ایسے غائب ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

سوشل میڈیا پر آئیے۔ واٹس ایپ میسج دیکھیے۔ تھوک کے بھاؤ سے مبارکباد کے پیغامات، تحسین و آفرین کے روح افزا جملے، تعزیتی کلمات، عبادت کے سندیسے، تعریفی تبصرے، گھٹیا لطیفے، نصیحتیں اور اقوالِ زریں، ملفوظات، حکمت، مظاہرِ حماقت وغیرہ دعوتِ مطالعہ دے رہے ہیں۔ وہاں اقبال اور غالب کے نام کے ساتھ پیش کیے گئے وہ گھٹیا بے تکے، چڑی سے اترے ہوئے بے وزن اشعار ملاحظہ فرمائیے جو ان عظیم شعرا کو ان کی حیات میں سنائے جاتے تو یقیناً ان کی تاریخِ وفات کچھ اور پیچھے سرک جاتی۔

راستے پر آئیے اور مجنوں کی طرح بدلتے ہوئے ان شاہراہوں کے نام پڑھیے، شہروں کے ناموں کے تغیرات سے عبرت حاصل کیجیے۔ اشتہارات، سائن بورڈ، ہدایات اور دیواروں پر لکھے جملوں کی سیر بھی کیجیے مثلاً (اشتہاروں کے درمیان) یہاں اشتہار لگانا منع ہے۔ (کوڑے کے ڈھیر پر) یہاں کچرا ڈالنا منع ہے۔ (در و دیوار پر) یہاں پیشاب کرنا منع ہے، اور (اسی کسی دیوار پر جلی حروف کے ساتھ) دیکھو دیکھو یہاں ایک گدھا... وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ بھی کئی چیزیں آپ کے ذوقِ مطالعہ کی منتظر ہیں۔ بجلی، پانی وغیرہ کے بل، بینک کا پاس بک، رسوئی گیس ریکارڈ بک اور ان سب کو پڑھنے والوں کے ماتھے کی شکنیں وغیرہ۔ ان سب کو پڑھتے پڑھتے تھک جائیں تو لوگوں کے چہرے پڑھیے۔ زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے اس کا مطالعہ کیجیے، غرض پڑھنے پر آئیں تو یہاں ہزاروں چیزیں ہیں۔ خدا را اس ایک مضمون کو بخش دیجیے۔

جنابِ من! آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ صرف پڑھتے ہیں اور پڑھتے ہیں، سنتے کہاں ہیں، کتابیں اور مضامین آپ سے باتیں کرتی ہیں، کچھ کہنا چاہتی ہیں، آپ سے کچھ مانگتی ہیں مگر شاید کان پر ہڑتال ہے یا عقل کنواں (اکل کنواں) میں کرفیو لگا ہوا ہے، آپ کو صرف پڑھنے کا چسکا ہے۔ آپ کتابیں پڑھتے ہیں، ان کی بات سنتے کہاں ہیں۔ ہم اسی وجہ سے کہے جا رہے ہیں کہ اسے نہ پڑھیے مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اس تحریر میں مضمون جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں، جیسا کہ آج کل بیشتر مضامین میں ہوا کرتا ہے اور جو آپ اس قدر انہماک کے ساتھ پڑھ رہے ہیں یہ اسی قبیل کی چیزوں میں بدترین مضمون ہے۔ مذکورہ تحریروں پر اکثر کسی مضمون کا دھوکہ ہوتا ہے، اس مضمون میں وہ بھی نہیں ہے۔ ان فالتو مضامین میں آخر تک ہر سطر پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے گویا آپ پیاز کے چھلکے اتار رہے ہیں، کچھ پانے کی امید کسی سراب کی طرح آپ کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ سیاسی رہنماؤں کے وعدوں کی طرح لگتا ہے آج نہیں تو کل کچھ ضرور حاصل ہوگا مگر آخر میں پیاز جیسے مضمون کے ختم ہونے پر کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا سوائے ایک ناگوار بو کے جو پیاز چھیلنے کے بعد انگلیوں سے چمٹ جاتی ہے۔ پھر بھی لگتا ہے کہ جس چیز کی جستجو تھی وہ تو ملی، بلکہ کچھ بھی نہ ملا مگر اس بہانے سے آپ نے دنیا دیکھ لی۔ اپنی ہٹ دھرمی کے سبب، بار بار روکنے کے باوجود جس نگارش کو آپ مسلسل پڑھے چلے جا رہے ہیں، اس سے آپ کو وہ احساس بھی حاصل نہیں ہوگا کیوں کہ اس میں کچھ ہے ہی نہیں۔ سوائے روک ٹوک کے جو ہمارے اکثر مضامین میں ہوا کرتی ہے اگر وہاں کچھ تو ہوتا ہے جس سے روکا جاتا ہے تاکہ آپ اپنے قدم روک لیں اور دنیا کا یا کم از کم آپ ہی کا بھلا ہو۔ یہاں آپ کو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئے گی جسے اپنانے سے آپ کو خبردار کیا جا رہا ہے، سوائے ایک مضمون کے جس کے مطالعے سے آپ کو منع کیا جا رہا ہے مگر آپ ایسے ڈھیٹ ہیں کہ بار بار دی جانے والی ہدایت کو نظرانداز کر کے اس طرح آگے چلے جا رہے ہیں جیسے... خیر اب ہم کیا کہیں!

آپ پڑھتے کیوں ہیں؟ اس سوال پر کبھی آپ نے غور کیا ہے؟ (بعض لوگ اتنا پڑھتے ہیں کہ ان کے پاس غور کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ یعنی کتابیں انھیں یہ موقع ہی نہیں دیتیں، بس خود سے چمٹائے رکھتی ہیں اور خود کو پڑھوائے چلی جاتی ہیں)

کچھ لوگ یہ کارِ خیر اس لیے انجام دیتے ہیں تاکہ باخبر رہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، جب سے اس کے بنانے والے نے 'ہوجا' کہہ کر اس پر پھونک ماری ہے یہاں ہر لمحہ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ کچھ لوگ بامقصد زندگی گزارنے کے عادی ہیں وہ پڑھنے کا پوت بن گئے ہیں جو بغیر کچھ دیکھے کہیں کرتا بھی نہیں۔ اس قسم کے صاحبان صرف وہ کتابیں پڑھتے ہیں جن کی افادیت اظہر من الشمس ہے مثلاً بینک پاس بک۔ اب دنیا میں ایسے لوگوں کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔ علم و ادب، فلسفہ، نفسیات وغیرہ کی کتابیں ان کے تحقیقی معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ بعض لوگ صرف امتحان کی ان کتابوں کو پڑھنا پسند کرتے ہیں جن کی مدد سے انھیں ڈگری حاصل کرنی ہے، اس کے بعد وہ ان کتابوں کو کباڑی کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔

عام موضوعات کی کتابیں بھی عام آدمی کی طرح بے وقعت ہو کر رہ گئی ہیں۔ انھیں کوئی پوچھتا نہیں۔ علم تو علم ہے کہیں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے کہ آپ بلا امتیاز کسی بھی قسم کی تحریر پڑھ جاتے ہیں۔ اب کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

تاہم ان دنوں شائع ہونے والی سیکڑوں کتابوں کی طرح میں آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ ان کتابوں کے مصنفین وہ بازیگر ہیں جو قارئین کو کھلا دھوکہ دیتے ہیں۔ وہ نہ آپ کی اخلاقی یا روحانی تربیت کرتے ہیں، نہ [illegible]، نہ ہی کسی صنف میں طبع آزمائی کر کے اس کی آبیاری کرتے ہیں، نہ وہ آپ کی خدمت میں ایسی تخلیقات پیش کرتے ہیں جن سے طبیعت میں بالیدگی اور فرحت پیدا ہو، آپ کی شخصیت کسی نئے افق سے آشنا ہو۔ وہ صرف اس لیے لکھتے ہیں کہ انھیں ادبی دنیا میں ادیب اور قلم کار بن کر ابھرنا اور شہرت پانا ہے۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے نہ ہی میں ادب میں کوئی نئی ادبی صنف ایجاد کر کے اس ایجادِ بندہ کے زور پر مشہور ہونا چاہتا ہوں۔ میں تو بس یونہی آپ کا ظرف، جذبۂ فرمانبرداری اور مطالعے پر عمل درآمد کی صلاحیت آزمانے کے لیے اور اپنے صبر کا امتحان لینے کے لیے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا ہوں۔

ہاں، تو بتائیے آپ مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟ علم حاصل کرنے کے لیے؟ زندگی، دنیا، کائنات، لوگوں اور چیزوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کے لیے؟ یعنی اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے؟ (تاکہ لوگوں پر رعب ڈالا جاسکے اور انھیں نیچا دکھایا جاسکے، بعض لوگ تو صرف اتنا ہی اور ویسا ہی پڑھتے ہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو جائے) آپ کے مطالعے کا مقصد خود کو بہتر بنانا، سنوارنا، اچھا انسان بننا، دوسروں کو پڑھا کر ان مقاصد کو حاصل کرنا ہے یا بس ٹائم پاس کرنا؟ آج کل وقت گزاری کا اعلیٰ ترین آلہ سوشل میڈیا ہے اسی لیے لوگ فیس بک کو عام کتابوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ کتابوں میں صرف کتابیں ہی ہوا کرتی ہیں۔ (اور کبھی کبھی وہ بھی نہیں ہوتیں) جب کہ فیس بک پڑھے چہروں اور بے پڑھے چہروں سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں یہ سہولت بھی ہے کہ تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں۔ اس کے علاوہ بھی وہاں اور بہت سے مواقع موجود ہیں۔ اس کے برعکس کتابیں چار دیواری میں بند محض ایک دقیانوسی قسم کی چیز بن کر رہ گئی ہیں۔ اب کتابوں کے دیوانے بہت کم رہ گئے ہیں اور جو ہیں وہ دیوانے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ بعض لوگ کتابیں اور رسائل صرف اس لیے خریدتے ہیں تاکہ انھیں ڈرائنگ روم میں سجا کر اپنے شوقِ مطالعہ اور دانشوری کا اعلان کیا جائے اور یہاں ایسے فنکار بھی موجود ہیں جو خریدنے اور پڑھنے کی زحمت اٹھائے بغیر بھی یہ [illegible] لیتے ہیں۔

دیکھیے نا۔۔۔ کہنے کے باوجود آپ یہاں تک چلے آئے۔ کیوں پڑھ رہے ہیں آپ؟ کیا آپ بھی دنیا کے ان بے شمار لوگوں میں سے ہیں جو بے سوچے سمجھے کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ کتابیں چھوڑیے، وہ بندگانِ خدا تو زندگی بھی ایسے گزارتے ہیں کہ بس جینا ہے، جی رہے ہیں۔ انھیں یہ بھی پتا نہیں ہوتا ہے کہ کیا پڑھنا ہے اور کیوں۔ [illegible] کتاب کوئی نماز تو ہے نہیں جس کے پڑھنے کے لیے باقاعدہ نیت کرنی پڑے۔۔۔ مثلاً نیت کرتا ہوں میں مطالعے کی، اس کتاب ...

(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

اردو اسامیوں پر مستقل تقرری کے لیے نمائندگی

نظام آباد (8 اپریل)۔ حلقہ اسمبلی بانسواڑہ کے انچارج اے روی عہدہ ریڈی کی جانب سے بانسواڑہ میں دعوت افطار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس موقع پر شیخ عمر (سابق رکن گرام پنچایت) نے گورنمنٹ کے مشیر محمد علی شبیر سے نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ ریاست گیر سطح پر اردو میڈیم کے لیے گیسٹ لیکچررس کی 69 اسامیاں خالی ہیں اور 15 اردو میڈیم کالج ہیں۔ 69 گیسٹ لیکچررس کام کر رہے ہیں جنہیں مستقل کرنے کے لیے جی او ایم ایس نمبر 162 جاری کیا گیا تھا لیکن انتخابات کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ محمد علی شبیر نے اس بارے میں ہمدردانہ غور کرتے ہوئے چیف منسٹر ریونت ریڈی سے نمائندگی کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اقدام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

فارسی زبان کی ترویج میں غیر مسلموں کا حصہ

حیدرآباد (16 مارچ)۔ ہندوستان میں فارسی زبان کو صرف مسلمانوں نے ہی پروان نہیں چڑھایا بلکہ غیر مسلموں ہندو، سکھ، عیسائی سبھی نے فارسی کی ترویج و اشاعت میں شانہ بہ شانہ حصہ لیا اور اپنی گراں قدر خدمات سے فارسی کے دامن ادب کو وسعت بخشی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شریف حسین قاسمی نے دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام "غیر مسلمان در ترویج و توسیعہ زبان و ادبیات و فرہنگ فارسی" کا اہتمام کیا گیا تھا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے کی۔ ممتاز مورخ پروفیسر وینک کمار مہمان خصوصی اور پروفیسر اشتیاق احمد (رجسٹرار) اور پروفیسر سید عبدالقادر رشید (استاد بشمو قاری کامل یونیورسٹی) مہمانان اعزازی کی حیثیت سے شریک تھے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ خاص طور پر ہندوؤں نے فارسی زبان کو پورے خلوص سے اپنایا۔ انہوں نے فارسی زبان میں مختلف علوم و فنون میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر ہندوستان کے فارسی ادب سے ہندوؤں کی خدمات کے حصے کو نکال دیا جائے تو صرف ایک چوتھائی ادب رہ جائے گا۔ ہندوؤں بالخصوص کائستھوں کی فارسی خدمات ہندوستان کے فارسی ادب کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ پروفیسر عزیز بانو (ڈین اسکول برائے السنہ لسانیات و ہندوستانیات) نے مہمانان کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں (صدر شعبہ و ڈائرکٹر کانفرنس) نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس بین الاقوامی کانفرنس میں آن لائن و آف لائن 75 مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر افتخار احمد کنوینر کانفرنس نے جلسے کی نظامت کی۔ ڈاکٹر محمد رضوان نے شکریہ ادا کیا۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر اشتیاق احمد (رجسٹرار) نے فرمائی۔ پروفیسر عبدالقادر رشید نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ڈاکٹر علی اکبر شاہ (رجسٹرار ڈاکٹر ذاکر حسین، انگریزی، نئی دہلی) اور پروفیسر عزیز بانو (ڈین اسکول آف لنگویجز) نے مہمانان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں نے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد (اسوسی ایٹ پروفیسر) نے شکریہ ادا کیا جب کہ ڈاکٹر محمد رضوان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ہندوستان ایکسپریس۔ دہلی)

شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر کا انعقاد

نئی دہلی (6 مارچ)۔ آج مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات، جے این یو کی طرف سے اسکول آف لنگویج لٹریچر اینڈ کلچرل اسٹڈیز کے کمیٹی روم میں سالانہ بعنوان شاہ ولی اللہ لیکچر۔ عنوان "دہلی: تحفظ روایات اور تہذیب کا سنگم" کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر صدر شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی پروفیسر حسنین اختر شریک ہوئے جب کہ صدارت مرکز برائے ہندوستانی زبان، جے این یو کے صدر پروفیسر انور پاشا نے کی۔ مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے صدر پروفیسر مجیب الرحمن نے شاہ ولی اللہ میموریل لیکچر کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور اس سالانہ لیکچر کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ پھر مہمان خصوصی کا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر حسنین اختر نے "دہلی: تحفظ روایات اور تہذیب کا سنگم" کے موضوع پر ایک نہایت عمدہ اور جامع خطاب پیش کیا جس میں انھوں نے دہلی تحفظ اور اطراف کے علاقے کی علمی، ادبی اور تہذیبی اہمیت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس سرزمین نے ہزاروں صوفیہ اور ادبا پیدا کیے ہیں۔ پروگرام کے صدر پروفیسر انور پاشا نے اپنے صدارتی کلمات میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے فروغ میں صوفیہ، تصوف اور اردو ادب کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ آخر میں مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے سابق صدر پروفیسر رضوان الرحمن نے تمام مہمانان کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ کئی سال سے اس میموریل لیکچر کا انعقاد عمل میں آ رہا ہے، لیکن آج کا پروگرام اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت مختلف تھا اور وقت و حالات کے پیش نظر بہت ضروری بھی۔ اس پروگرام میں جے این یو کے علاوہ دیگر جامعات کے اساتذہ و طلبہ بھی موجود تھے۔ (انقلاب۔ دہلی)

ڈاکٹر ہلال بدایونی کی کتاب

"گفتگو چاند سے" کی رسم رونمائی

لکھنؤ (13 مارچ)۔ بدایوں ضلع ادبی تخلیق کی وجہ سے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ اسی ضلع کے نوجوان شاعر ڈاکٹر ہلال بدایونی نے ضلع کا نام پھر روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر ہلال بدایونی کی ہندی میں لکھی گئی کتاب "گفتگو چاند سے" کا ملک کے معروف قلم کاروں کے ہاتھوں حیدرآباد کے بین الاقوامی مشاعرے میں اجرا کیا گیا جس میں ہندوستان کے علاوہ دبئی، کویت، بحرین، نیپال اور عرب کے شعرا نے شرکت کی اور شاعر ڈاکٹر ہلال بدایونی کو ان کی کتاب کے اجرا پر مبارک باد دی۔ واغ دہلوی فاؤنڈیشن کے بانی و صدر سید مشکین احمد کی جانب سے رویندر بھارتی تھیٹر، حیدرآباد میں منعقد پانچویں بین الاقوامی مشاعرے میں ڈاکٹر ہلال بدایونی کی کتاب کی بین الاقوامی سطح پر رونمائی کی گئی۔ ڈاکٹر ہلال بدایونی کی ہندی دیوناگری رسم خط میں شائع ہونے والی کتاب میں غزلیں، نظمیں، گیت، قطعات اور دوہے شامل ہیں جو خاص طور پر ان ہندی بولنے والوں کے لیے ہیں جو ہندی لکھنے اور پڑھنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں اور ادب سے دل چسپی رکھتے ہیں۔

عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کی مسدودی کے 74 برس بعد اب اردو یونی ورسٹی میں ایل ایل بی کا آغاز

حیدرآباد۔ دنیا کی سب سے پہلی اردو یونیورسٹی یعنی جامعہ عثمانیہ کے آغاز سے لے کر 1950 تک قانون کی تعلیم (ایل ایل بی) اردو میڈیم سے دی جاتی رہی تھی۔ جامعہ عثمانیہ سے اردو میڈیم میں قانون کی تعلیم مسدود ہونے کے پورے 74 برس بعد مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کو اس بات کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے کہ نئے تعلیمی سال 2024 سے اردو میڈیم کے طلبہ اب قانون کی تعلیم بھی اردو میں حاصل کر پائیں گے۔ وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے اس تعلق سے باضابطہ اعلان کیا ہے۔ پروفیسر تبریز احمد (ڈین اسکول برائے قانون) کے مطابق قانون میں کیریئر جہاں آپ کو معاشی استحکام بخشتا ہے وہیں سماج میں آپ کو بااثر ہونے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ قانون کی تعلیم کے ذریعے طلبہ متنوع صلاحیتوں کو فروغ دے سکتے ہیں جو صرف قانون میں بلکہ دیگر میدانوں میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ قانون کی تعلیم طلبہ میں جہاں تجربے کی مہارت کو فروغ دیتی ہے وہیں اپنے سوچنے سمجھنے کے طریقے پر بھی بامعنی اثر پیدا کرتی ہے تاکہ اصل کام کے دوران سماج کے مفادات کو ملحوظ رکھا جائے۔ قانونی ماہرین کو آج مختلف مواقع دستیاب ہیں جیسے وہ غیر سرکاری اداروں، سرکاری اداروں کے علاوہ انسانی حقوق کے اداروں، تھنک ٹینکس، تحقیقی اداروں، صنعتی، ٹیکنالوجی اور ڈیفنس، تجارت اور سرمایہ کاری، لیگل پروسیس آؤٹ سورسنگ (ایل پی اوز)، قومی و بین الاقوامی کمپنیوں اور کارپوریشنوں میں ان ہاؤس کونسل میں کام کر سکتے ہیں۔ پروفیسر تبریز احمد نے مزید بتایا کہ قانونی ماہرین کی بڑھتی ضرورت کے پیش نظر مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی میں اسکول برائے قانون (School for Law) کا آغاز کیا گیا ہے۔ اسکول کے تحت پانچ سالہ بی اے ایل ایل بی (آنرس)، تین سالہ ایل ایل بی کے علاوہ دو سالہ ایم اے (لیگل اسٹڈیز) اور ایک سالہ ایل ایل ایم (6 اسپیشلائزیشنس کے ساتھ) اور پی ایچ ڈی (قانون) پروگراموں کا آغاز کیا گیا ہے۔ بی اے ایل ایل بی اور ایل ایل بی میں داخلے بار کونسل آف انڈیا کی منظوری پر دیے جائیں گے۔ بار کونسل نے یونی ورسٹی کا معائنہ کر لیا ہے امید ہے کہ جلد ہی منظوری مل جائے گی۔ بی اے ایل ایل بی، ایل ایل بی اور ایل ایل ایم کے لیے آن لائن فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 20 مئی 2024 ہے جب کہ ایم اے لیگل اسٹڈیز کے لیے درخواستیں 30 جون تک داخل کی جا سکتی ہیں۔ مزید تفصیلات 8755929751 یا 7289933715 سے حاصل کی جا سکتی ہیں یا dean.law@manuu.edu.in پر ای میل کیا جا سکتا ہے۔

سراج زیبائی کو ایوارڈ

چنئی (22 مارچ)۔ ٹمل ناڈو کے مشہور شاعر و ادیب جناب سراج زیبائی کے تاثراتی و تجزیاتی مضامین کے مجموعے "لہجوں کی مہک" (حصہ دوم) کو امیر النساء ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن مدھیہ پردیش کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد قومی ایوارڈ برائے سال 2023-24 کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ موصوف کی دو حال ہی کتابیں منظر عام پر آ کر ارباب علم و دانش سے خراج وصول کر چکی ہیں۔ اس سے قبل بھی آپ کی کئی کتابوں کو متعدد اعزازات حاصل ہو چکے ہیں۔

شوکت علی فہمی یادگاری لکچر کا انعقاد

نئی دہلی (10 مارچ)۔ پرانی دہلی کے جامع مسجد علاقے میں دین دنیا پبلشنگ کی جانب سے مفتی شوکت علی فہمی کی یاد میں 'ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم' کے عنوان سے لکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ تقریب کی نظامت کے فرائض شیبا اسلم فہمی نے انجام دیے۔ مفتی شوکت علی فہمی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مفتی شوکت علی فہمی کی شخصیت سے آپ بھی شناسا ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مفتی شوکت علی فہمی کی ولادت 24 دسمبر 1901 کو اتر پردیش کے میرٹھ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے صحافت کا سفر 1923 سے شروع کیا اور تبھی سے وہ 'دین دنیا' سے جڑے۔ انھیں خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی ملی۔ ان کا بہت لمبا صحافتی کیریئر رہا۔ وہ 1923 سے 1984 تک 'دین دنیا' کے پرنٹر پبلشر رہے اور 1993 میں ان کی وفات ہوگئی۔ انگریزی دور میں بھی مفتی شوکت علی فہمی نے اپنے اخبار کے ذریعے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ انھوں نے انگریزی حکومت کی سختیوں کو بھی برداشت کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ خوش نصیب ہیں مفتی شوکت علی فہمی جو آج ان کی اولاد انھیں یاد کر رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنھوں نے مفتی شوکت علی فہمی کو دیکھا بھی اور پڑھا بھی ہے۔ وہ مورخ بھی تھے اور مفسر بھی، وہ جنگ آزادی کے مجاہد بھی تھے اور صحافی بھی تھے۔ وہ میرٹھ کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس کا علمی مشغلہ تو تھا ہی بلکہ جد وجہد آزادی میں بھی اس کا ایک شاندار رول رہا تھا۔ دارالعلوم دیو بند کے مولانا محمد قاسم نانوتوی اس ادارے اور خاندان سے براہ راست منسلک تھے اور کہا جاتا ہے کہ 1857 میں جس جنگ آزادی کی شروعات میرٹھ سے ہوئی تھی اس کے محرک مفتی شوکت علی فہمی کے آبا واجداد ہی تھے۔ مسجد فتح پوری کے شاہی امام مولانا ڈاکٹر مفتی مکرم احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں سماجی، سیاسی اور سرکردہ شخصیتوں کے علاوہ بڑی تعداد میں اہل علاقہ نے شرکت کی۔ (صحافت۔ دہلی)

غالب کی شاعری کی عصری معنویت

امروہہ (21 مارچ)۔ جے ایس ہندو پی جی کالج امروہہ کے شعبۂ اردو میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع 'غالب کی شاعری کی عصری معنویت' تھا۔ سیمینار میں شعبے کے بہت سے طلبہ نے حصہ لیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار میں کالج کے پرنسپل پروفیسر ویریندر سنگھ نے طلبہ کو غالب کی شاعری کی اہمیت کے بارے میں بتایا اور سیمینار میں طلبہ کی کثیر تعداد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام منعقد کرنے سے طلبہ کے لیے مستقبل میں ترقی کی راہیں آسان ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ پرنسپل صاحب نے اس کامیاب پروگرام کے انعقاد کے لیے شعبۂ اردو کو مبارک باد پیش کی۔ چیف پروکٹر ڈاکٹر نونیت بشنوئی نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں مبارک باد دی اور ایسے پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب دلائی۔ شعبۂ ہندی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر جاوید نے اپنے کلیدی خطبے میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب کی شاعری نہ صرف اردو زبان بلکہ دوسری زبانوں کے شعرا کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر سعید الحسن نے انجام دیے۔ آخر میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد موسیٰ نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

(صحافت۔ دہلی)

رفتید ولے نہ از دل ما

پروفیسر راشد انور راشد

علی گڑھ۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، شاعر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر راشد انور راشد کا طویل علالت کی وجہ سے ممبئی کے ایک اسپتال میں علاج کے دوران 7 اپریل 2024 کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بچے ہیں۔ پروفیسر راشد انور راشد نے بی اے رانچی یونیورسٹی رانچی سے کیا تھا جب کہ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ وہ ایک بڑے اسکالر تھے جس کا اندازہ ان کی نثری اور شعری خدمات سے ہوتا ہے۔ انھوں نے پچیس سے زائد کتابیں شائع کیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا، جن میں دہلی اردو اکیڈمی ایوارڈ، یوپی اردو اکیڈمی ایوارڈ، بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ، مغربی بنگال اردو اکیڈمی ایوارڈ، دار جلنگ کلا پرشٹھا ایوارڈ اور صدف انٹرنیشنل ایوارڈ شامل ہیں۔

پروفیسر سراج الحق نادر رضوی

سیوان۔ اردو کے مشہور ادیب اور شاعر ڈاکٹر سراج الحق نادر رضوی کا 4 اپریل 2024 کو لکھنؤ کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا جہاں وہ زیر علاج تھے۔ مرحوم کے ڈی ایس کالج گورکھ پور، لکھنؤ یا میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات تھے۔ نادر رضوی ایک معتبر شاعر، نثر نگار، بہترین مقرر اور نیک دل انسان تھے۔ اردو، عربی اور فارسی کی استعداد قابل رشک تھی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ غوثیہ حلیمیہ، بڑہریا ضلع سیوان سے حاصل کی، بعدازاں جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے عالم و فاضل کی سند حاصل کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے پی ایچ ڈی اور ایم فل کرنے کے بعد نیٹ کوالیفائی کیا۔ اس کے بعد ان کی تقرری بھگوان پور ہائی اسکول میں ہوگئی۔ 2020 میں اسسٹنٹ پروفیسر بن کر لکھنؤ یا چلے گئے لیکن اہل و عیال کو سیوان میں ہی رہنے دیا۔ وہ سیوان کی ادبی و شعری نشستوں میں ضرور شرکت کرتے تھے۔ ان کے مضامین اور شعری تخلیقات تواتر سے اردو کے موقر رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ یرقان کے مرض میں مبتلا تھے۔ پٹنہ سے دہلی تک علاج کرایا، مرض میں کچھ افاقہ ہوا اور پھر دوبارہ نوکری پر چلے گئے مگر پچھلے ایک ماہ سے دوا کا اثر ختم ہوگیا اور مرض بڑھتے بڑھتے جاں لیوا ثابت ہوا۔ آخرکار ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی گاؤں موضع اتول ضلع سیوان لے جایا گیا جہاں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔

پروفیسر فیروز احمد

دہرہ دون۔ اردو کے معروف محقق پروفیسر فیروز احمد کا دہرہ دون میں 3 مارچ 2024 کو انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے سے بیمار تھے۔

پروفیسر فیروز احمد کی پیدائش اور تعلیم گورکھپور میں ہوئی لیکن عملی زندگی کا بیشتر حصہ راجستھان یونیورسٹی، جے پور میں گزرا۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد انھوں نے دہرہ دون میں رہائش اختیار کی اور وہاں بھی تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا۔ ان کی تصانیف / تالیفات میں مہدی افادی، انتخاب خطوط مہدی افادی، محنت کی برکت، انتخاب میر ناصر علی، باغ و بہار، اختر شیرانی: تحقیقات اور راجستھان میں اردو وغیرہ شامل ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے NCPUL کے لیے 'راجستھان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ' پر ایک پروجیکٹ مکمل کیا تھا۔ ان دنوں وہ امیر خسرو پر کام کر رہے تھے اور مضامین کا مجموعہ بھی زیر ترتیب تھا۔

علیم صبا نویدی

چنئی۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، شاعر اور محقق علیم صبا نویدی کا 24 فروری 2024 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین امیر النسا بیگم قبرستان، دماما ناگا گارڈن، چنئی میں ہوئی۔ ان کا پیدائشی نام علیم صبا ہے اور قلمی نام علیم صبا نویدی۔ وہ 28 فروری 1937 کو چنئی (تمل ناڈو) کے ضلع شمالی آرکاٹ کے ایک قصبہ امور (والا جاپیٹ) میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے 1968 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازی نمبرات سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ کثیر التصانیف ادیب ہیں جن میں طرح نو، طرز بر، نقش کیر، اثر خامہ، عرش غزل، نور السماوات، تشدید، اردو شاعری میں نئے تجربے، مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر، شمالی مشرقی تمل ناڈو میں اردو، تمل ناڈو کے مشاہیر ادب، آزاد غزل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علیم صبا نویدی کے تبصرے، مضامین اور مکتوبات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ چنئی کے بابائے اردو کہلاتے تھے۔ ان کی بیشتر کتابیں ان کی صاحبزادی جاویدہ حبیب نے ترتیب دی ہیں جن میں خواتین تمل ناڈو کی روشن تحریریں، دکن کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق و تنقید، تمل ناڈو کا منفرد شاعر: دانش فرازی، علیم صبا نویدی کے خطوط، صبا کے غنچے قابل ذکر ہیں۔

نذیر احمد وانی

سری نگر۔ وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے معروف صحافی اور روزنامہ 'صبح کشمیر' کے مدیر اعلا نذیر احمد وانی طویل علالت کے بعد 2 مارچ 2024 کی صبح انتقال کر گئے۔ خاندانی ذرائع نے بتایا کہ نذیر احمد وانی نے ہفتے کی صبح یہاں شیر کشمیر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز صورہ میں زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ وہ طویل عرصے سے صاحب فراش تھے اور گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ان کا تعلق سری نگر کے بیرباغ علاقے سے تھا۔ وادی میں شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات اور تنظیموں نے ان کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کیا۔

قمر مسعود

اڑیسہ۔ مٹکے کی معروف شخصیت قمر مسعود کا 23 مارچ 2024 کی شب کو انتقال ہوگیا۔ ان کی پیدائش ضلع کے جوگی ہاٹ واقع بگدھرا گاؤں میں 30 ستمبر 1939 کو ہوئی تھی۔ انھوں نے 18 مارچ 1963 کو بہ حیثیت معاون مدرس آزاد اکیڈمی جوائن کیا تھا اور تدریسی ملازمت سے وہ 2000 میں سبک دوش ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم بگدھرا مڈل اسکول نیز ایچ ڈی ہائی اسکول اڑیسہ میں ہوئی جب کہ ثانوی تعلیم کٹیہار ڈی ایس کالج سے ہوئی تھی۔

قمر مسعود نے یادداشت پر مشتمل اپنا سوانحی خاکہ 'اوراق زندگی' بھی لکھا تھا جس میں انھوں نے شب و روز کے واقعات، مشاہدات اور نرم گرم حالات تحریر کیا ہے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹیاں شامل ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **حرف واثر**
مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
ضخامت : 264 صفحات
قیمت : 450 روپے
ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
تبصرہ نگار : سید اختر اعظمی

E-mail: sakhtar0075@gmail.com

تحقیق متنوع رنگ ہوتی ہے۔ اسے موضوعات کے دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ فن و شخصیت، مکتوب نگاری، تاریخ نگاری، نادر تحریریں، نثر و نظم، اداروں سے وابستگی، رسائل و جرائد وغیرہ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر خامہ فرسائی کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اگرچہ شبلی شناسی کے نئے زاویے تلاش کرنے میں دل چسپی رکھتے ہیں تاہم گاہے گاہے وہ دیگر موضوعات کا بھی احاطہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ مضامین مختلف رسائل و جرائد کے صفحات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ان کی یکجائی کرکے وہ کتابی صورت میں قارئین کے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی نوعیت کی ہے۔

'حرف واثر' دو درجن مضامین کی یکجائی ہے جن کے موضوعات متنوع رنگ ہیں۔ 'سرسید اور اعظم گڑھ' میں بتایا گیا ہے کہ 11 جولائی 1874 کو ڈپٹی نذیر احمد نے ایک مجلس یہاں منعقد کی تھی جس میں بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو مدعو کیا گیا تھا۔ یوں طلبائے اعظم گڑھ کے روابط سرسید احمد خاں سے ہوئے۔ اسی تعلیم کی بدولت وہ اعلا عہدوں پہ فائز ہوئے۔ شبلی نعمانی سے بھی ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ 'سرسید اور شبلی' کے نام سے ایک کتاب بھی شائع ہوچکی ہے۔ 'مولانا سید سلیمان ندوی اور تحفۃ الطلبا' ہے۔ بنیادی اصل مولوی سید محمد الیاس رضوی کا 1923 میں سیرت النبی کے مصنف سے تحفۃ الطلبا کے طرز عمل سے متعلق آگاہی پر ان کا تحریری جواب ہے جسے منشور کی حیثیت حاصل ہے۔ 'علامہ اقبال کا ایک خط ماہنامہ 'شمع' آگرہ (مدیران: پروفیسر محمد حبیب، حسن عابد جعفری) کے ایک بین عمل ہونے پر شاعر مشرق کے تحریری تاثرات ہیں۔ 'رسالہ شمع' نہایت دل چسپ ہے۔ تاریخی مضامین کی ندرت کے اعتبار سے اس شمع کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "روشن از دے دی شب و هم روشن است"۔ 'عبدالسلام ندوی کا ایک نایاب رسالہ' عبداللہ ابن عمر' 35 صفحات پر مشتمل بیس زبان میں سیرت صحابہ پر تبصرہ ہے جس میں استاد شبلی نعمانی کے اسلوب کے نقل کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ 'اقبال احمد خاں سہیل کی دو نادر تحریریں' میں معارف، انجمن اصلاح اور 'غزل گوئی' پر ایک نظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 'محبوب الرحمٰن کلیم اور ان کی دو نو دریافت غزلیں' میں وکیل قزل اشاعت کے لیے بھوپال سے ارسال کی گئی تھی اور دوسری آگرہ سے۔ 'علی گڑھ کالج میں 1902 میں شعر و شاعری کے ہونے والے مشاعرے' والے روشن ہستی سے 'طرحی غزل' شہزادی جہاں آرا اختر شاہجہاں پر لاجواب تصنیف پیش کی۔ 'مولانا عبدالسلام ندوی نعیم کی چند نادر غزلیں' روایتی انداز کی ہیں۔ یہ شبلی کے شاگرد تھے۔ اسے ممتاز ادب تقلیل کی جانب اور یادگار کاوش تصور کیا جاسکتا ہے۔

'شاہ افضل الہ آبادی ایک گمنام صوفی' آزادی تصوف و سلوک کے دلدادہ تھے جنھوں نے تاریخ اعظم گڑھ کی ترتیب و تشکیل کی۔

اعظم گڑھ کے چند گمنام شعرا اور ان کا کلام' کا تذکرہ 'یادِ بزمِ دامنِ گل چیں' اور 'باغ سخن' میں ہوا ہے۔ ان میں اسیر جنانی کے شاگرد حافظ محمد احمد آزاد، مولوی محمد احسن اللہ تیمی، عباس مبارک پوری کے چھوٹے صاحبزادے منشی محمد ظہیر علی اظہر کی تفصیلات موجود ہیں جب کہ شاہ رجب علی شہر، خواجہ رحمت اللہ خاں، شمس الدین شمس اور شیخ ہادی حسن سفیر کے بارے میں تفصیلات نایاب ہیں۔ 'اعظم گڑھ میں اردو صحافت اور قدیم مطابع' میں بتایا گیا ہے کہ فروری 1886 میں چار صفحات پر مشتمل پہلا اخبار ہفت روزہ 'آفتاب' ہند شائع ہوا۔ ہفتہ وار 'خورشید' کی اشاعت اس کے ڈیڑھ برس بعد شروع ہوئی۔ ماہنامہ 'معارف' دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے ترجمان کی حیثیت سے 1916 میں جاری ہوا۔ یہاں کے چار مطابع تھے۔ مطبع نیر اعظم (مطبع نول کشور کی شاخ) مطبع محمدی، مطبع عزیزی، مطبع لبرل۔ 'معارف کی ادبی خدمات' میں بتایا گیا ہے کہ یہ شبلی کے علمی و ادبی منصوبے کا حصہ تھا، ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے جولائی 1916 میں 'معارف' کا اجرا کیا۔ مشاہیر قلم کاروں کی شمولیت کے سبب یہ انسائیکلوپیڈیائی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ 'اسلامیات کے چند اہم اردو رسائل و جرائد کے اشاریے' میں بتایا گیا ہے کہ پہلا مطبوعہ اشاریہ 1970 میں شائع شدہ اورینٹل کالج میگزین لاہور کا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اس حوالے سے خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ 'حافظ ڈاکٹر محمد مرتی: ایک مثالی رہنما' میں مصری صدر کی شخصیت پہ طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ 'ڈاکٹر آدم شیخ کی یاد میں' مجلہ 'نوائے ادب' کے مدیر اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے فن و شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔ 'محمد حامد سراج مرحوم: ایک نادیدہ دوست کی عمر دوستی' میں بتایا گیا ہے کہ ان کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا اور تقسیم کے وقت پاکستان ہجرت کرگئے۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے (وقت کی فصیل، برائے فروخت، بخیہ ادھڑی، برادہ) شائع ہوئے۔ 'ڈاکٹر ابرار اعظمی کی یاد میں' میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ وہ اردو کے ممتاز ادیب و شاعر، نقاد اور ماہر تعلیم تھے۔ 'ڈاکٹر عقار رحیم کی یاد میں' کے توسط سے ان کی شعر و ادب سے والہانہ وابستگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ 'پروفیسر حنیف نقوی: چند یادیں' میں ان کے ساتھ گزری چند ادبی یادوں کو زندہ کیا گیا ہے۔ 'ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی: یادیں، باتیں اور سوغاتیں' میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ 'انور اعظمی: ایک مطالعہ' عالم، ادیب، شاعر، افسانہ نگار، صحافی، مبصر اور ادیب اطفال کے فن و شخصیت کا جائزہ ہے۔ 'ممتاز مورخ پروفیسر احمد سعید' میں میدان تحقیق میں سرگرم شخصیت کے فن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ 'آہ! محمد فاروق اعظمی' فرزند شبلی کالج، استاد اور ماہر تعلیم کے فن کو بہترین خراج تحسین ہے۔ 'ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی کا ایک خط' ان کے علمی حوالے کو معتبر کرتا ہے۔ 'شمس الرحمٰن فاروقی کی یاد میں' یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی کئی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے۔ ان میں سب سے اہم مضمون ڈاکٹر ابرار اعظمی کا ہے جس میں ان کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست درج کی گئی ہے۔ 'میری علمی اور مطالعاتی زندگی' میں صاحب کتاب نے اپنے مطالعے اور تحریروں پہ گفتگو کی ہے۔

کتاب ہذا میں موجود تمام تحریریں یا تو تحقیقی نوعیت کی ہیں یا تاثراتی اندازکی، دونوں میں مصنف کی محنت، لگن، جانفشانی اور عرق ریزی صاف جھلکتی ہے۔ ان تحریروں کی یکجائی مصنف اور قاری دونوں کے لیے فال نیک ہے۔

◆◆

بقیہ: اسے نہ پڑھیے، پلیز!

(صفحہ 3 سے آگے)

کے حصول واسطے انجینئرنگ کے امتحان کے بعد میرا نوکری شریف کی طرف۔ اس قسم کی کتابیں ان الفاظ کی ادائیگی کے بغیر ہی پڑھی جاتی ہیں۔ ڈگری ملنے کے بعد پھر کوئی ان کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ بلا وجہ کتب یا رسائل خریدنا اور پھر انھیں سنبھال کر رکھنا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ ڈگری مل جائے تو لوگ (ایک ہی سانس میں) سب سے پہلے وہ کتابیں اور ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہیں۔ انھیں ٹھکانے لگانے کے بعد وہ نوکری حاصل کرنے کی دوڑ میں لگ جاتے ہیں۔

دنیا پڑھے لکھے لوگوں سے بھری پڑی ہے جن میں سے بیشتر اس طرح زندگی گزار رہے ہیں جیسے ان کے لیے کالا اکشر بھینس برابر ہو۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انھیں انسانیت، ادب، تہذیب اور شائستگی سے کوئی لگاؤ نہیں بلکہ خدا واسطے کا بیر ہے۔ واشنگ مشین سے نکلے ہوئے کپڑے یقیناً صاف ستھرے ہوسکتے ہیں، ہمارے تعلیمی نظام کے نکلے ہوئے افراد کا انسان ہونا ضروری نہیں ہے۔ غالب نے اسی موقعے کے لیے کہا تھا: آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ آخر اتنا چھ لکھ کر کیا ہوا، اسی لیے یہ عرض ہے کہ آپ جو اس مضمون کو محض آسانی بھی پڑھنے پر مصر ہیں، اگر اس سے دست بردار ہو جائیں تو قیامت نہیں آجائے گی۔ قیامت سے یاد آیا کہ آسمانی کتابوں سے حروف کا اٹھ جانا بھی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔ ان دنوں یہ حال ہے کہ زیادہ کتابوں میں الفاظ کی بھرمار ہے مگر معانی ناکل پرواز ہیں، لکھنے والے بے پر کی اڑانے لگے ہیں۔ یوں بھی ہر تحریر ادب عالیہ نہیں ہوتی اور جو آپ کے پیش نظر ہے وہ تو قطعی نہیں ہے، اس لیے براہ کرم اس سے صرف نظر کریں، ہمارے علم و ادب کا بڑا حصہ اسی لائق ہے اور یہ مضمون بھی اس میں شامل ہے۔

یہ مضمون اگر آپ پہلی ہی سطر پر چھوڑ دیتے تو میری خواہش ہوتی کہ آپ کے گلے میں فرماں برداری کا ایک خوب صورت ساتمغہ ڈال دوں، مگر دنیا میں تمغا، انعام، اعزاز اور معاوضہ وغیرہ یہ چیزیں ہی سب کچھ نہیں ہیں، اسی لیے مخلصین ان کی تمنا کے بغیر بھی بہت سے ہفت خواں طے کرتے ہیں۔ کبھی بذات خود اس مہم جوئی کا حاصل ہوتی ہے۔ کبھی کشور کشائی میں آوارہ سفر کرتی ہے تو کبھی کوئی سرکشی در در بھٹکاتی ہے۔ کچھ نہ ملنے میں بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔ جو اس سفر کا حاصل ہوا کرتا ہے، کچھ نہیں تو عبرت یا تجربہ ہی سہی۔ افسوس! اس شوق مطالعہ سے آپ کو وہ بھی حاصل نہ ہوا۔ یقین آگیا؟ میں غلط تھا۔

آخر منع کرنے کے باوجود آپ نے کمال ڈھٹائی کے ساتھ یہ پورا مضمون پڑھ ڈالا۔ خیر کیا کریں، یہ پوری دنیا ہی چھوٹے بچوں کا ایک ایسا گھر ہے جہاں لاکھ روکنے ٹوکنے کے باوجود بچے وہ سب کر گزرتے ہیں جو ان کے جی میں آتی ہے کہ من مانی کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ کچھ ملے نہ ملے دل کو چین تو مل ہی جاتا ہے۔

محمد اسد اللہ
30، گلستان کالونی، بزد پالٹ، راجا اسراتی شمشیر نگر، ناگپور۔ 440013
E-mail: zarnigar2005@yahoo.com

بقیہ: تیغ مسعود کی شخصیت کے چند پہلو: کچھ دیدہ کچھ شنیدہ

(صفحہ 2 سے آگے)

کو اپنی جگہ بنانے میں اتنی دیر لگی۔ خدا خدا کر کے پروگرام ختم ہوا۔ تیغ بھائی مسکرا رہے تھے صرف چپکے سے اتنا کہا کہ سوال فاروقی صاحب نے اچک لیا تھا میں بس دیکھتا رہ گیا۔ مظہر نے بہت کر کے فاروقی صاحب سے کہا کہ اگر یہ پروگرام چلا گیا تو میری نوکری بھی چلی جائے گی۔ فاروقی صاحب بولے نوکری تو میں بھی کرتا ہوں دوسرے آپ نے مجھے میری رائے کے اظہار کے لیے بلایا تھا یا اپنی رائے بتانے کے لیے تیغ مظہر خاموش ہو گئے اور بات لائیو تھی کہ پورا پروگرام براڈکاسٹ کر دیا گیا۔ فاروقی صاحب نے شاید ٹی وی دیکھا تھا۔ جلسے میں انھوں نے ڈائرکٹر ولایت جعفری کو فون کر کے کہا کہ میرا چیک فوراً بھجوا دیجیے۔ قاعدہ یہ ہے کہ پروگرام ٹیلی کاسٹ کے بعد ہی چیک بنتا ہے مگر دوسرے دن صبح دفتر کھلتے ہی چیک بنوائے گئے اور ڈاک کے ذریعے فاروقی صاحب کا چیک بھیج دیا گیا۔ اسی بہانے میرا اور تیغ بھائی کا بھی چیک بن گیا۔

ایک بار ڈاکٹر نے ان کے دانتوں کی جڑ سے ایک کالی کالی چیز نکالی اور حیرت سے اسے دیکھتا رہا اور بولا مجھ میں نہیں آتا کیا چیز ہے تیغ صاحب نے بھی حیرت کا اظہار کیا جب کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اتنے زمانے کی پریکٹس میں اس طرح کی کوئی چیز مسوڑھے سے نکلتے میں نے نہیں دیکھی۔ تیغ صاحب نے بھی حیرت کا اظہار کیا ہر چند وہ خوب جانتے تھے کہ مسوڑھے سے کیا نکلا ہے۔

تیغ بھائی ہم لوگوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے انھوں نے کئی بار بہت اہم مشورہ دیا کہ ضروری نہیں ہے کہ ایک دن میں کوئی مضمون مکمل کرنے کی کوشش کی جائے آپ ایک دن میں آدھا صفحہ یا ایک صفحہ ضرور لکھیے اتنا وقت تو آپ لوگ نکال ہی سکتے ہیں۔ شارق قدوائی سے بھی وہ بہت خوش رہتے تھے اور ان کی تحریروں کی تعریف بھی کرتے تھے۔ محسن خاں ان دنوں خوب افسانے لکھ رہے تھے ہم لوگ اپنی اپنی نئی نئی تحریریں تیغ بھائی کو سناتے تھے۔ وہ ان تحریروں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میرے ایم اے کرنے کے زمانے میں ہی سید محمد اشرف صاحب آئی اے ایس کی ٹریننگ کے سلسلے میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ عرفان بھائی ان کے پھوپھا ہوتے تھے اس طرح بہت جلد ہم لوگوں کی دوستی اشرف بھائی سے ہو گئی۔ ان کا افسانہ 'ڈار سے بچھڑے' 'گفتگو' کے خاص نمبر میں شائع ہو چکا تھا اور ہم لوگ پڑھ بھی چکے تھے۔ وہ بھی تیغ بھائی کے یہاں ایک نشست میں آئے اور اپنا افسانہ 'منظر' سنایا جو بہت پسند کیا گیا۔ وہ اس وقت تک منظر، چکر، ببول کے کانٹے اور کئی افسانے لکھ چکے تھے تیغ بھائی ان کی زبان اور جذبات نگاری کی تعریف کرتے تھے۔

تیغ صاحب اس قدر شریف اور نجیب انسان تھے کہ وہ اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ سامنے والے کی دل آزاری نہ ہو خواہ وہ شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔ جب میں نے تحقیق شروع کی تو چند وہیں صفحے لکھنے کے بعد میں تیغ بھائی کو دکھانے جاتا تھا۔ تیغ صاحب یہ کبھی نہیں کہتے تھے کہ یہ غلط ہے۔ وہ کہتے تھے یہ بھی ٹھیک ہے مگر اس طرح ہو جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کئی مہینے یہ سمجھنے میں لگ گئے کہ تیغ صاحب جب یہ کہتے ہیں یہ بھی ٹھیک ہے مگر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ غلط ہے اسے اس طرح ہونا چاہیے مگر کے بعد وہ جو بتاتے تھے وہ صحیح ہوتا تھا۔ ان کے گھر اردو اکادمی کے ایک صاحب آتے تھے تو دیر تک بیٹھتے تھے۔ ایک دن تیغ صاحب نے ہم لوگوں سے ہنستے ہوئے بتایا کہ میں ان کے جانے کے بعد ایک چادر دھو کر بچھاتا ہوں کہ یہ بے وقوف ہیں مگر دوسری بار نے پردہ پچھلے جانے کو تو دے دیتے ہیں۔

جب میں ان کے یہاں جانے لگا تو کبھی کبھی ان کے دانتوں میں شدید درد ہوتا تھا ایسی صورت میں گفتگو تو دور انھیں ملنے میں بھی پریشانی ہوتی تھی۔ ان کے گھر سے تھوڑی دور پر مشہور محقق کاظم علی خاں صاحب رہتے تھے۔ میں تیغ بھائی کے یہاں گیا تو انھوں نے خود آ کر بتایا کہ دانتوں میں شدید درد ہے جاتے ہیں خان صاحب جو تحقیق کا کوئی مشکل مسئلہ حل کرنا چاہتے تھے آ گئے میں نے عرض کیا کہ تیغ بھائی کے دانتوں میں شدید درد ہے اس لیے ہم لوگوں کو چلنا چاہیے مجبوراً خان صاحب اٹھ لیے تیغ صاحب گیٹ تک چھوڑنے آئے گیٹ پر خان صاحب نے اپنا تحقیق کا مسئلہ چھیڑ ہی دیا اور آدھے گھنٹے تک وہ اپنی کارگزاری اور مواد کی فراہمی کی داستان سناتے رہے بڑی مشکل سے میں انھیں اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوا۔

ایک بار تیغ بھائی سے دو پروفیسر صاحبان لکھنؤ کی تاریخ پر کچھ معلومات حاصل کرنے تشریف لاتے ہیں۔ شارق قدوائی بھی اسی درمیان آ گئے۔ تیغ بھائی بہت دیر تک انھیں اودھ کی تاریخ کے بارے میں بتاتے رہے اور ایک دو کتابیں لا کر دکھائیں کہ مستند کتب ہیں۔ دونوں حضرات فوٹو کاپی کرانے جو باہر ہی ہوتی تھی چلے گئے ہم لوگوں نے اجازت چاہی تیغ بھائی نے خلاف توقع ایک گانے کا ٹکڑا سنایا ہمیں اس حال میں کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو خیر ہم لوگ بیٹھ گئے۔

ایک دن کشمیر سے ایک پروفیسر صاحب رثائی ادب پر کچھ مواد کی فرمائش کرتے ہوئے آ گئے۔ تیغ بھائی نے خاصی پرانی کتابیں نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بتایا کہ اب یہ کتابیں پرانی ہونے کی وجہ سے ان کا کاغذ اتنا خستہ ہو گیا ہے کہ ذرا سا مڑنے پر ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی احتیاط کے ساتھ تصویر شاید کھینچی جا سکے۔ میں نے اسی دوران تیغ بھائی سے دریافت کیا کہ کیا انھوں نے اس درمیان کوئی افسانہ لکھا ہے انھوں نے ہمیشہ کی طرح بتایا کہ لکھا تو ہے چاہیں بتایا نہیں۔ انھوں نے افسانہ میرے حوالے کر دیا میں ان کے گھر سے متصل ان کی ہی دوکان جو کرائے پر تھی اس کے یہاں فوٹو کاپی کرانے چلا گیا فوٹو کاپی کراتے ہوئے میں نے دیکھا کہ پروفیسر موصوف بھی تیغ صاحب کی دی ہوئی کتابوں کی فوٹو کاپی کرا رہے ہیں اور مشین پر رکھتے ہی کاغذ ٹوٹ رہا ہے خیر میں نے افسانے کی کاپی کرا کر تیغ بھائی کی کاپی ان کے حوالے کر دی اور انھیں بتایا کہ پروفیسر صاحب بھی باہر آپ کی کتابوں کی فوٹو کاپیاں کروا رہے ہیں۔ تیغ بھائی کے منھ سے بے ساختہ ارے، نکلا اور وہ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب تشریف لائے تیغ صاحب نے کتاب ایک بار کھول کر دیکھی جس کا کاغذ اس طرح ٹوٹ گیا تھا کہ مرثیہ کا پورا بند پڑھنا ناممکن ہو گیا تھا مگر انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں صرف یہ سوچتا ہوا واپس آ گیا کہ اتنا صبر کوئی کیسے کر سکتا ہے۔

پروفیسر آصفہ زمانی صاحبہ نے بتایا کہ شعبے کا چپراسی بہت لاپروا ہو گیا تھا۔ ایک دن وہ اپنے مقررہ وقت پر کلاس لینے گئیں تو شعبہ کا گیٹ نہیں کھلا تھا۔ انھوں نے ایک پرچہ تالے میں تیغ بھائی کے لیے لگا دیا اور واپس لوٹ آئیں۔ دوسرے دن آصفہ زمانی نے شکایت کی کہ کل میں واپس لوٹ گئی چپراسی وقت پر تالا ہی نہیں کھولتا ہے۔ تیغ بھائی بولے جی ہاں آج اس سے کہہ دیا ہے کہ بھائی شعبہ وقت پر کھول دیا کیجیے ورنہ ڈاکٹر صاحبہ بے چاری واپس لوٹ گئیں۔ آصفہ صاحبہ نے کہا تیغ صاحب آپ کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ آتا کیوں نہیں ہے بھائی تیغ صاحب بولے پھر آپ اظہار کیوں نہیں کرتے جواب ملا کیا اظہار کروں صبر کر لیتا ہوں۔

(باقی آئندہ)

مخدوم محی الدین کی یاد میں

(بقیہ صفحہ [illegible] سے آگے)

دوا کیا ہے؟
چاند کو چاند بنا
رات کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے کالے آنسو
رات سے کہہ دو
کہ وہ بکھرا دے
(رات)

کالے آنسو، چاند کا پگھلنا، اداس رات کی آنکھیں زخم خوردہ سا ماحول پیدا کر دیتے ہیں اور اس پر لہجے کی استعاریت رنگ آمیزی کرتی ہے۔ مخدوم اپنی نظم میں الفاظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معانی میں پراسرار فرق پیدا کر دیتے ہیں جس سے ان کے لہجے کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ قمر کی سمت پر ان کی نظم اس کی عمدہ مثال ہے۔

مخدوم کے آخری مجموعۂ کلام 'بساط رقص' کے 'گل تر' والے حصے میں بیشتر ایسی نظمیں پائی جاتی ہیں جو ان کے نئے ادب سے انسلاک کی شاہد ہیں۔ وہ ایک عظیم شاعر تھے اور حیدرآباد کی ادبی فضا میں ایک بھرپور مقام رکھتے تھے۔

مخدوم کی چند نظمیں اس طرح دامن دل کو گرفتار کر لیتی ہیں کہ ہر لفظ، ہر ترکیب اور طرز اظہار اپنی ندرت کے لیے بے مثل لگتا ہے مثال کے طور پر ان کی نظم 'قید' پیش کی جا سکتی ہے۔ آپ بھی سنیے:

قید ہے قید کی معیاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے رات کی تاریکی ہے تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے

مخدوم کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس ابھرتا ہے کہ اسی لفظ اور موضوع کو جو ہم سے عام طور پر ملتا ہے تو مروجہ معنوں میں اس قدر شاعرانہ نہیں لگتا، مگر شاعر نے اپنے اعلا خلاقانہ طریقۂ اظہار سے اور نئے آہنگ سے ہمکنار کر کے معرکۃ الآرا بنا دیا ہے۔ اصوات، صوتی زیر و بم، ارتعاش، وقف و حرکت سے ہر شعر میں ایک انجانی سی کھنک اور دل کشی آ گئی ہے۔ اس طرح ایسا فن پارہ سامع اور قاری کو عجیب سی مسرت بخش دیتا ہے۔

اچھے شاعر کی شاعری کی زیریں رو اس کی تخلیقی فکر کو جھٹلاتی نہیں۔ اس بات کو ہم صدق دل سے مانتے ہیں کہ شاعری کی زندگی خلوص اظہار سے معنون ہے۔ شاعری کی سب سے صحیح شکل وہ کلام ہے جو حادثاتی طور پر ایک مجتہد صلاحیت والے ذہن پر الہام ہو جائے۔ ان کی کئی تخلیقات فلموں میں گیت کی طرح استعمال ہوئیں اور زبان زد خاص و عام ہوئیں۔ یہ تو ایک جانی مانی حقیقت ہے کہ ایک کامیاب فن پارہ ایک اچھی شعری صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ ایک اچھی شعری صلاحیت خلوص اور کرافٹ دونوں کو مکمل تر کر دیتی ہے۔

مخدوم کی شاعری کے تقریباً تمام موضوعات ان کی ذات پر مرکوز ہیں یہی وجہ ہے کہ اس میں خلوص بھی ہے اور داخلی حرارت بھی۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار ہم خیالوں کو قریب تر لگتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مخدوم کی شاعری پر خاطر خواہ تبصرہ کرنے کے لیے طویل مضمون درکار ہے مگر فی الوقت اشارتی طور پر چند سطور پیش کی جا رہی ہیں، جو بے حد مختصر ہیں۔

اسلم عمادی
12-2-823/C/47، ایل آئی سی کالونی، مہدی پٹنم،
حیدرآباد-500028 (اے پی)
E-mail: aslamimadi@yahoo.com

مخدوم محی الدین کی یاد میں

اسلم عمادی

مخدوم محی الدین ہندو پاک بلکہ اردو کے عالمی منظرنامے میں حیدرآباد کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کے ذکر کے بغیر جدید اردو شاعری کی تاریخ ہی رقم نہیں ہو سکتی۔ مخدوم بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں میں سے تھے۔ انھیں اپنی عوامی شاعری کے لیے جانا جاتا تھا لیکن مخدوم کا رخشِ قلم اپنی معصری شاعری کے بھی ہم رکاب تھا۔ بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کی شاعری زمانے کے ساتھ ساتھ لفظ و معنی کا پیرہن بدلتی رہتی ہے اور مخدوم انھی میں سے ایک شاعر تھے۔ انھوں نے زخم سے گل و درد سے خوشبو کی طرف سفر کیا تھا۔ ان کی شاعری میں خارِ رہِ گل کی خلش کا بھی لطف آتا ہے۔

مخدوم کی شاعری کی طاقت، انقلابی سوچ اور غلامانہ زندگی سے آزادی کی جد و جہد کا بے پایاں جذبہ تھا۔ مخدوم کی شاعری کی ابتدا سلطنتِ آصفیہ سے بغاوت کی پرشور تحریک سے ہوئی۔ آزادیٔ ہند کے بعد ان میں یہ انقلابی روح ترقی پسند تحریک کی طاقت بن گئی۔ ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی قوت مستقبل سے امیدی ہے۔ استحصال سے کامل ہے کہ آنے والا کل خوش آئند ہے جس میں آج کی ظلمتوں اور وحشتوں کے داغ دھل جائیں گے گویا اس شبِ تار کی صبح روشن اور تابندہ ہوگی۔

تمام عمر مخدوم حامی ترقی پسند ہی رہے۔ انھوں نے اپنا محاذ کبھی نہیں بدلا۔ اس کے باوجود یہ محسوس کیا گیا ہے کہ وقت کی بدلتی ہوئی ضروریات کے تحت کچھ نہ کچھ شعری رویے میں اس بدلاؤ یعنی جدیدیت کا اثر تو آ رہا تھا اور انھوں نے جدید شاعری کے اہم شارحین سے کئی نظریاتی مباحث میں حصہ لیا۔ مخدوم اپنی شاعری میں ایک معتبر اور باوقار متکلم کی طرح ابھرتے ہیں۔ ان کی شاعری شعری آہنگ میں گفتگو کا روپ دھار لیتی ہے، جس میں کبھی حدود و قواعد و ضوابط سے انحراف نہیں کیا گیا ہے۔ یہ گفتگو عموماً براہ راست ہے جو استعارات اور کنایات سے آراستہ زبان میں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں پس منظر عام زندگی سے منتخب ہوتا ہے کسی مابعد الطبیعاتی، تصوراتی یا سرّی ماحول کا استعمال کبھی نہیں ہوا ہے۔ وہی گھر، شہر اور قریب تر زندگی سے منتخب شدہ مضامین کا ذکر کرتا ہے۔

انھوں نے اپنی نظموں میں شعریت کے ارتکاز کی کوشش کی ہے تو ایسی تراکیب استعمال کی ہیں جو قدرے استعاراتی ہیں لیکن عوام کے فہم سے بعید تر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں رجزیہ آہنگ صوتی زیر و بم کی مرتب تکرار سے مملو ہے۔ مخدوم کی شاعری میں رومانی عنصر زیریں رو جیسا ہے۔ ان کی شاعری کی لذت اور دل کشی بے مثل تھی، مثلاً

کسی خیال کی خوشبو، کسی بدن کی مہک
در قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

دل کی محراب میں اک شمع جلی تھی سرِ شام
صبح دم ماتمِ اربابِ وفا ہوتا ہے...!!

ترے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے
دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے

مخدوم کی غزل جدید لب و لہجے اور بے مثل پیرایۂ اظہار کے لیے پہچانی جاتی ہے۔ اپنی شاعری کے دورِ آخر میں ایسی بے پناہ غزلیں لکھیں کہ اردو ادب کا ایک خوب صورت باب قائم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ان پر ماحول کی تبدیلی کا یہ اثر رہا ہو۔ اس زاویے سے مطالعہ ایک تحقیق طلب موضوع ہے۔ ان کے غزلیہ اشعار حسنِ کلام، روانی اور معنویت کی بنا پر مخدوم شاعری کی نادر مثالیں ہیں، مثلاً:

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
پھول کے ہار، پھول کے گجرے
شام پھولوں کی رات پھولوں کی
آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات، بات پھولوں کی

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
خواب کی طرح آپ آتے رہے جاتے رہے
عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے
چشم و رخسار کے اذکار کو جاری رکھو
پیار کے نامے کو دہراؤ کہ کچھ رات کٹے

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے
کسی خیال کی خوشبو، کسی بدن کی مہک
در قفس پہ کھڑی ہے کوئی پیام لیے

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

ترقی پسند شاعر ہمیشہ مشعل بردار کا روپ دھارے محنت کش اور ستم خوردہ سماج کو ایک روشن مستقبل اور اس کے جلو میں ایک تابناک زندگی کی طرف لے جانے کا دعوے دار رہا ہے۔ وہ ہمیشہ اس زعم میں رہا ہے کہ اس نے سارے اقتصادی، سماجی اور عالمگیری مسائل کی گتھی سلجھالی ہے۔ اس کے پاس جو اشتراکی کلید ہے وہ تمام اقبال زدہ ستم خوردہ کو فتح کر سکتی ہے، کھول سکتی ہے۔ ہر ترقی پسند شاعر اپنے مخاطب راہ رو کو راستے میں ٹھہر ٹھہر کر آدابِ جنون اور رسوماتِ انقلاب سے واقف کرتا رہتا ہے کہ کہیں سامراج کی چال بازی کے سامنے یہ رہروانِ رہِ طلب بھٹک یا بھٹک نہ جائیں۔ بڑی ذمے داری ان شاعروں نے سنبھالی تھی۔

1960 کے بعد ان کی شاعری چونک سی پڑی۔ اس سلسلے میں ان کی فکر میں تجسس داخل ہو گیا۔ وہ مسائل کو پہچاننے کے لیے دوبارہ جنگ وہ کرتے گئے۔ ان کی شاعری میں 'میں' سے زیادہ 'ہم' کی کارکردگی نظر آتی ہے اور ان کے لہجے میں مصلحت اور دھیما پن محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'اپنا شہر' دیکھیے:

یہ شہر اپنا عجب شہر ہے کہ راتوں میں
سڑک پہ چلیے تو سرگوشیاں سی کرتا ہے
بلا کے زخم دکھاتا ہے
... رازِ دل کی طرح
دریچے بند، گلی چپ، نڈھال دیواریں
کواڑ مہر بلب
گھروں میں میتیں ٹھہری ہوئی ہیں برسوں سے
کرایہ پر...!! (اپنا شہر)

اس نظم کے اندر شناسائی گھر کا ایک عجیب سا ماحول پیدا کیا ہے اور شاعر کے اندر چھپے ہوئے درد اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے ہوئے دریچوں اور خاموش گلیوں میں تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری کی ایک اور خوبی پردے کے اندر چھپا ہوا شعور ہے جو ہمیشہ ماحول اور الفاظ کے در و بست میں جھانکتا رہتا ہے۔ ان کی آخری نظم 'رات' میں:

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، روڈگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ پانچ روپے، سالانہ 200/روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by *Abdul Bari* on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006. Editor: *Dr Ather Farouqui*